

ہنستی آنکھیں اور رقص

یہ جنوری کی ایک سرد رات تھی۔ پچھلے تین روز وقفہ وقفہ سے بارش ہوتی رہی تھی اور آسمان پر بادل غبار کی مانند چھائے رہے تھے۔ لیکن آج رات مطلع صاف تھا اور آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستارے معمول سے کچھ زیادہ روشن تھے۔ کمرے میں گیس کا ہیٹر جل رہا تھا۔ لوگ کرسیوں اور صوفوں کے علاوہ فرش پر بچے قالین پر بھی بیٹھے تھے۔ وہ فرش پر کھڑک کر آتش دان کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ اگرچہ باہر سردی کافی شدید تھی لیکن کمرہ خوب گرم تھا۔ پھر بھی وہ آتش دان کے قریب سمٹی بیٹھی تھی جیسے سردی سے ٹھٹھہ رہی ہو۔ کمرے کے ایک طرف کھانے کی میز رکھی تھی جس کے ساتھ ہی کچن کا دروازہ کھلتا تھا۔ باقی جگہ پر ایک صوفہ سیٹ اور دو کین کی چیئرز رکھی تھیں۔ درمیان میں کھٹے کی ٹاپ والی سینئر ٹیبل اور صوفوں کے پہلو میں ویسی ہی سائیڈ ٹیبل پڑی تھیں۔ دیوار پر ایک پینٹنگ آویزاں تھی جس میں شرمائی لاجی ہیر کورا، ٹھانہا بنسری کی تان سار ہا تھا۔ مہمانوں میں تین جوڑے تین خواتین اور ایک معروف گلوکار آئے ہوئے تھے۔ اور میزبان وہ خود تھی جو اپنے عہد کی مشہور رقصہ تھی جس کے رقص بعض فلموں میں بھی عکس بند ہو چکے تھے۔ سب لوگ باتوں میں مصروف تھے لیکن وہ الگ تھلگ بیٹھی خاموشی سے آگ ٹاپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی پوری طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے تجسس ہو رہا تھا کہ یہ کون ہے۔ یہ تھوڑا سا منہ موڑے تو میں اس کا چہرہ دیکھ سکوں۔ اس کو جیسے میری خواہش کا علم ہو گیا تھا اور وہ میری خواہش کی تعمیل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے رخ موڑا تو مجھے اس کا چہرہ نظر آ گیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک مانوس چمک تھی۔ یہ گوری رنگت کا چہرہ اور اس چہرے میں مانوس والی سیاہ آنکھیں۔۔۔۔۔ کہاں دیکھی تھیں؟ میں سوچنے لگا، کہاں دیکھی تھیں۔ اور پھر ذہن میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھل گئی۔ میں جلدی سے میزبان خاتون کی تلاش میں اٹھا۔ وہ کھانے کی میز پر ڈشیں رکھ رہی تھیں اور وہاں سے ہٹ کر کچن کی طرف چلی گئیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا۔ ”نورین ایک بات تو بتاؤ۔ جو خاتون آتش دان کے آگے بیٹھی گیس کے ہیٹر سے آگ ٹاپ رہی ہے اس کا کیا نام ہے؟“

ان کی مختلف شہروں میں پوسٹنگد ہوتی رہیں۔ شاہین انیسر سروس چلی تو علی پی آئی اے سے ریٹائرمنٹ لے کر وہاں چلے گئے۔ حال ہی میں وہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے ہیں۔“

میں نے علی احمد خان کی طرف دیکھا۔ وہ ہلکی سانولی رنگت اور ڈھیلے پھولے ہوئے پیٹ والا مرد تھا جس کے سر کے بال بھی کم کم ہی رہ گئے تھے۔

”آپ کی بیگم کالج میں بڑی ذہین سٹوڈنٹ تھیں۔“ میں نے تعریف کی۔
”یہ تو مانتے ہی نہیں کہ میں کالج کی تعلیم یافتہ ہوں۔ اب آپ کی شہادت کے بعد انہیں مان لینا چاہیے کہ میں نے ماسٹر کیا ہوا ہے۔“

اس پر میرے ساتھ وہ دونوں بھی ہنسنے لگے۔ نفرت کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ نورین نے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اب موسیقی کا پروگرام ہوگا اور ساتھ ساتھ قبوے کا دور بھی چلے گا۔ گلوکار اپنا ہارمونیم لے کر نیچے قالین پر بیٹھ گیا اور غزلیں سناتا رہا۔ آخر میں فیض کا کلام سنایا گیا۔

تیری آنکھوں کے سوا اس دنیا میں رکھا کیا ہے
میں نے نفرت کی طرف دیکھا تو اس کی شخصیت میں آنکھیں بہت نمایاں اور حاوی تھیں۔
اب باری تھی نورین کے رقص کی!

وہ اپنے وقت کی نامور رقاصہ تھیں۔ اس نے لڑکپن میں میڈم آزوری سے کلاسیکل رقص، کٹھک اور بھارت ناٹیم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی کمر اس کی گردن اور اس کی ہانہوں میں ہلا کی لچک تھی اور بجلی کی تیزی سے حرکت کرتے پیروں میں غضب کی دھمک تھی۔ اس کا سراپا ایک قیامت تھا۔ ناچتے وقت اس کے بدن کا انگ انگ جذبوں کی کہانی کھول کھول کر بیان کرتا۔ اس کے ہاتھ انگلیاں اور نگاہیں سر بستہ رازوں کو عیاں کرتے۔ وہ خاص خاص محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی اور فن کو سمجھنے والے قدر دانوں سے داد پاتی تھی۔ اس نے آزادی کے بعد کی دودھائیوں میں بعض فلموں میں بھی پاپر اور نیم کلاسیکی رقص نکس بند کرائے تھے۔ اسے غیر ملکی سربراہان مملکت کی آمد پر بھی حکومت کی طرف سے رقص کے لیے بلوایا جاتا تھا۔ پھر یکا یک اس نے شادی کر کے گھر بسایا لیا اور کمرشل رقص ترک کر دیا۔

چار پانچ سو برس قبل انارکلی مغل دربار میں رقص کرتے کرتے شہزادہ سلیم کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اس پادشاہ میں وہ دیوار میں چنوا دی گئی۔ انارکلی امر ہو گئی۔ پانچ ہزار برس قبل مہنوداڑو کی رقصہ کو بڑی پذیرائی ملی۔ وہ اپنے فلسفی بادشاہ کے سامنے ناچ ناچ کر محفل آرائی کرتی رہی جو اس کے لیے عبادت بھی تھی۔ اس پکی مٹی کے پتلوں میں مجسم کر دیا گیا۔ اس کے مجسموں کو دیکھ کر آج بھی لگتا ہے کہ وہ رقص کناں ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ انسانی تہذیبوں کے سنجیدہ طالب علم تاریخ عالم کے محققین، علمائے ثقافت، مہنوداڑو و تہذیب کے کھوجیوں کی تحقیق کے قدردان ہیں اور کھدائیوں میں نکلنے والے فلسفی بادشاہ کے سامنے ناچ ناچ کر محفل آرائی کرتی رہی جو اس کے لیے عبادت بھی تھی۔ اسے پکی مٹی کے پتلوں میں مجسم کر دیا گیا۔ اس کے مجسموں کو دیکھ کر آج بھی لگتا ہے کہ وہ رقص کناں ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ انسانی تہذیبوں کے سنجیدہ طالب علم، تاریخ عالم کے محققین، علمائے ثقافت، مہنوداڑو و تہذیب کے کھوجیوں کی تحقیق کے قدردان ہیں اور کھدائیوں میں نکلنے والے فلسفی بادشاہ اور رقصہ کے پتلوں کو اس تہذیب کے سہیل کے طور پر یکساں اہمیت دیتے ہیں۔

عہد حاضری کی یہ رقصہ بھی اپنے فنی کیرئیر کے عروج پر تھی جب اس نے اپنے رقص کو اپنے پیار کی بھینٹ چڑھا دیا اور اپنے پیار سے شادی کر کے گھر بسالیا۔ نہ وہ دیوار میں چنوائی گئی اور نہ ہی پتلوں میں مجسم کی گئی۔ بلکہ وہ تو ایک زندہ حقیقت ہے جو کبھی کبھی اپنے شوق کی خاطر اپنے جسم کو صحت مند اور متناسب رکھنے کے لیے اپنی فنی مہارت کو زندہ رکھنے کے لیے رقص کر لیتی ہے۔ ذرا عمر رفتہ کو آواز دیتا۔

سب نے نورین سے رقص کی فرمائش کی۔ وہ بولی۔ ”میں آپ کی فرمائش پوری کر دیتی ہوں اگرچہ میں عرصہ سے آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔ اب اتنا سٹیمنا (Stamina) بھی نہیں رہا۔“

وہ دوسرے کمرے سے کیسٹ پلیئر اٹھا لائی اور ایک نیم کلاسیکل فلمی گانا آڈیو کیسٹ پر لگا دیا۔ نورین نے اپنا دوپٹہ کمر کے گرد باندھ لیا اور کیسٹ کی دھن کے ساتھ اعضاء کی شاعری شروع کر دی۔ اس کی آنکھیں اس کی گردن اس کی ہانپیں اس کی ہاتھوں کی انگلیاں اس کی ٹانگیں اور اس کے پاؤں سب ایک روہم کے ساتھ متحرک تھے۔ جتنی دیر ریکارڈ چلتا رہا۔ نورین کے اعضاء رموز و اسرار کھول کھول کر بیان کرتے رہے اور پھر کیسٹ کے ساتھ ہی رقص بھی اختتام کو پہنچا۔ ایک اور گیت کی

دھن بچنے لگی جو مقبول عام تھی اور قدرے تیز تھی۔ نورین نے دوپٹہ کمر سے اتار کر پرے پھینکا اور دوسری دھن پر بھی رقص کناں ہو گئی۔ اس کے اعضاء تیزی سے حرکت کرتے رہے اور حاضرین محفوظ ہوتے رہے۔ دھن ختم ہوئی تو رقص بھی ختم ہو گیا۔ نورین پھولے سانسوں کے ساتھ ایک صوفے پر گر گئی۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اور تالیوں کی داد پا کر بڑی مطمئن اور خوش تھی۔

عہد شباب میں وہ جب ناچتی تھی تو مداح اس کے جسم کے خدو خال اس کی جوانی کی اٹھان اور سر بلع الحرقی کی داد دیتے تھے۔ لیکن اب وہ کبھی کبھار رقص کرتی ہے تو مداح اس کے فن کی اس کی مہارت اور ابھی تک جوان دکنے کی داد دیتے ہیں۔ اور یہی صلہ پانے کے لیے وہ کبھی کبھار ایسی محفل کا اہتمام کر لیتی ہے۔ آخر اس میں کیا برا ہے۔



itsurdu.blogspot.com